تالیف

خورشید رضوی' ادب کی دنیا میں ایک مستند نام ہیں۔ ان کی' ایک خوشبودار کتاب نظر سے گزری۔ نام تالیف تھا۔ مختلف خاکے' مضامین اور تراجم کا ایک جاندار مجموعہ۔ پڑھتا چلا گیا۔ تقریباً ایک شب کے جگ رتے میں یہ قیمتی تصنیف پڑھ ڈالی۔ اب عادت سی بن گئی ہے۔ کہ ہر کتاب کو دو سے تین بار پڑھتا ہوں۔ کیونکہ صرف ایک بار پڑھنے سے کسی بھی تصنیف کو باریکی سے سمجھنا قدرے مشکل ہے۔ خورشید رضوی صاحب سے ملاقات آج تک نہیں ہو پائی۔ ویسے میں جن لوگوں کی نثر یا شاعری کو پسند کرتا ہوں۔ ان سے بہت کم ہی ملتا ہوں۔ اس عجیب عادت کا وجود صرف ایک وجہ سے ہے۔ جب آپ کسی بھی انسان کے کام کو بہتر پاتے ہیں۔ تو اس کی شخصیت کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ یہ تو طے ہے کہ انسان کی ذات' اس کے تخلیقی کام میں ابھر کر سامنے ضرور آتی ہے۔ مگر یہ ممکن ہے کہ وہ تخلیق کار' بحیثیت انسان' اپنی بلند پایہ تخلیق سے حد درجہ مختلف یا متضاد ہوں۔ اور پھر قاری نے جو خاکہ اس شخص کا بنایا ہوتا ہے، جس مسند پر اسے بٹھایا ہوتا ہے۔ اس کی ذات' کہیں اس پیمانہ سے کم نہ ہو۔ خورشید رضوی نے کمال تخلیقی کام کیا ہے جو واقعی پڑھنے والا بھی ہے۔ بلکہ حد درجہ توجہ سے قابل مطالعہ ہے۔ ناصر کاظمی: بہت مدت بعد 1960 میں میرا عزیز دوست اسلم انصاری اور میں دولز ہاسٹل لاہور میں برابر برابر کمروں میں مقیم تھے۔ کہ اسلم کی ناصر کاظمی سے دوستی ہوگئی اور وہ اسلم کے پاس آنے جانے لگے۔ پہلی مرتبہ میں نے انھیں وہیں قریب سے دیکھا۔ موضوع سخن میر تقی میر تھے۔ ان کی بھاری بھرکم ''کلیات'' سامنے دھری تھی اور ناصر کاظمی محاسن کلام میر میں مستغرق ایک مخصوص مسکراہٹ اور از خود رفتگی کے ساتھ مسلسل گفتگو کر رہے تھے۔ ایسے موقع پر وہ سامع سے زیادہ شاید خود سے محو کلام رہا کرتے تھے۔ وہ میر کے اس سادہ و پرکار فن کی تہوں کی وضاحت میں مصروف تھے جس کو خوشبو کی طرح محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن مٹھی میں نہیں لیا جا سکتا۔ اسی دوران انھوں نے ''کلیات'' اٹھا کر اپنا ایک پسندیدہ شعر نکالا اور عجیب سرمستی کے عالم میں پڑھا۔

گوندھ کے گویا پتی گل کی' وہ ترکیب بنائی ہے
رنگ بدن کا تب دیکھو جب چولی بھیگے پسینے میں

وہ تا دیر چمکتی ہوئی آنکھوں اور چھوٹے چھوٹے پر جوش جملوں سے اس شعر کے ایک ایک لفظ کی داد دیتے رہے۔ میر ان کا جنم جنم کا ساتھی معلوم ہوتا تھا اور وہ خود میر کا اوتار نظر آتے تھے۔ میں نے اس کو دیکھا: مجید امجد کے بارے میں درج ہے۔

میں نے اس کو دیکھا ہے
اجلی اجلی سڑکوں پر اک گرد بھری حیرانی میں
کون ہے جو بل کھاتے ضمیروں کے پر پیچ دھندلکوں میں
روحوں کے عفریت کدوں کے زہر اندوز محلکوں میں
لے آیا ہے یوں بن پوچھے' اپنے آپ
عینک کے برفیلے شیشوں سے چھنتی نظروں کی چاپ

یہ سطور مجید امجد کی ایک نظم سے اقتباس کی گئی ہیں جو انھوں نے منٹو پر لکھی ہے۔ میں نے چونکہ منٹو کو نہیں دیکھا اور مجید امجد کو دیکھا ہے اس لیے ''گرد بھری حیرانی''، ''ضمیروں کے پر پیچ دھندلکوں'' اور ''عینک کے برفیلے شیشوں سے چھنتی نظروں کی چاپ'' کا ذکر آتا ہے تو میرے ذہن میں معاً ایک کہنہ سال عینک کے سفید شیشوں کے پس منظر میں مجید امجد کی اپنی شبیہ ابھر آتی ہے جس میں دور دیس سے آئے ہوئے ایک اجنبی ہنس کی سی خوفزدہ معصومیت کا تاثر ملتا تھا۔ 1958 کی بات ہے' میں گورنمنٹ کالج منٹگمری (اب ساہیوال) میں سال سوم کا طالب علم تھا۔ شاعری کا جنون نیا نیا سر میں سمایا تھا۔ دیوان غالب اور آب حیات کے مطالعے کے بعد میں نے خاصی بزرگانہ قسم کی غزلیں کہنی شروع کر دیں اور کمال سادگی سے انھیں تنقیدی مجلسوں میں پیش کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔ نتیجہ یہ کہ یار لوگوں نے میرے خوب خوب پرزے اڑائے لیکن انھیں مجلس سے مجھے وہ فیض بھی حاصل ہوا جس کی یاد آج میرے لیے از حد قیمتی اور خوشگوار ہے یعنی مجید امجد سے ملاقات۔

سید ضمیر جعفری: جعفری صاحب کے شعری مزاج کا ایک اور رخ جوان کے کمال فن کا آئینہ دار ہے لیکن جس پر نسبتاً کم توجہ دی گئی ہے ''ولایتی زعفران''، یعنی منظوم تراجم ہیں جو انھوں نے انگریزی نظموں سے کیے۔ ''مسز ولیم'' جس کی عشوہ طرازیاں' جعفری صاحب کی عمر عزیز کے ساتھ ساتھ مسلسل بڑھتی چلی جا رہی ہیں' بنیادی طور پر اسی سلسلے کی نظم ہے۔ اس نظم کے بارے میں جعفری صاحب کا کہنا ہے کہ اگر میری نہیں ہو سکی تو اصل شاعر کی بھی نہیں رہی۔ یہ بات دراصل ''ولایتی زعفران'' کے بارے میں مجموعی طور پر بھی کہی جا سکتی ہے۔ یعنی جعفری صاحب کے ترجمے کی خوبی ہے کہ انھوں نے ان نظموں کو محض اپنی زبان ہی میں منتقل نہیں کیا بلکہ بڑی چابکدستی سے ان میں اپنے دیس کی آب و ہوا بھی گھول دی ہے۔ ''اڑنگ بڑنگ'' میں فون پر ہونے والی اوٹ پٹانگ گفتگو کے سلسلے میں ایک بدیسی شاعر کے خیالات کو یوں ''ترجمایا'' ہے:

''... کیا تم اپنی نیلی ٹوپی مانٹریال سے لائے ہو
یا چکوال سے لائے ہو
چاند گہن کی رات سنا ہے بنتو ڈھول بجاتی تھی
اللہ بخشے تیری بیوی قیمہ خوب پکاتی تھی
آدھا خود کھا جاتی تھی...''

ڈاکٹر طٰہٰ حسین: سوربون میں طٰہٰ کی خصوصی توجہ فلسفہ اور اجتماعیات پر رہی۔ علاوہ ازیں قدیم یونانی و رومی اور جدید فرانسیسی ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ مصر کو یونانی تمدن سے آگاہ کرنے کے لیے اس نے تراجم کا کام شروع کیا۔ چنانچہ ''Sophocles'' کے بعض ڈراموں کو عربی کا جامہ پہنایا۔ اور ''Racine'' کے ڈرامے ''Andromaque'' نیز ''Voltaire'' کے ''Zadig ou la Destinee'' کے ترجمے اور اس کے علاوہ بھی بعض تصانیف پیش کیں۔ طٰہٰ کی تصانیف مختلف علمی و ادبی موضوعات پر بہت کثیر التعداد ہیں جن کا مجمل سا تذکرہ بھی باعث طوالت ہوگا۔ باقاعدہ تصنیف و تالیف کے علاوہ اس نے صحافت اور سیاسی امور میں بھی حصہ لیا چنانچہ دستوری احرار پارٹی کے پرچے ''ایساسۃ'' کا مدیر رہا۔ 1924 میں جامعہ اہلیہ حکومت کی تحویل میں آ گئی اور طٰہٰ حسین کلیہ الآداب میں عربی ادب کا استاد مقرر ہوا۔ طٰہٰ حسین کی طبیعت میں بے باکی کا عنصر بہت نمایاں ہے جس کی مثالیں اس کی زندگی میں جا بجا ملتی ہیں۔ اس بے باکی کا ایک مظاہرہ اس کی تصنیف ''فی الشعر الجاہلی'' کی صورت میں ہوا جو اس نے 1926 میں شایع کی۔ اس کتاب میں طٰہٰ نے ڈیکارٹ (Descartes) کا منہج فکر اختیار کیا یعنی پختہ اور غیر متزلزل یقین تک پہنچنے کے لیے ہر چیز پر شک کرنا۔ چنانچہ اس نے قدیم نظریات کو اضافی قرار دیتے ہوئے ان پر نظر ثانی کا جواز پیدا کیا۔ ادبی تنقید میں آزادی فکر کی دعوت دی اور آواز اٹھائی کہ قدماء کا ہر نظریہ ضروری نہیں کہ ہمارے نظریات سے زیادہ صائب ہو۔ اس تصنیف کا مختصر لب لباب یہ سمجھ لیجیے کہ طٰہٰ نے جاہلی شاعری کے بارے میں یہ رائے پیش کی کہ اس کا ایک بڑا حصہ بعد کے لوگوں کا من گھڑت ہے جسے بعض اغراض کے تحت قدیم شعراء سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ اس بات پر بہت سے نقاد بگڑ کھڑے ہوئے اور طٰہٰ کے خلاف ایک زبردست تحریر طوفان بپا ہوا۔

خورشید نے کمال مضامین لکھے ہیں۔ ان کا مطالعہ غور سے فرمایئے۔ حقیقت میں یہ بیش قیمت تحریریں ہیں۔ پڑھتے جایئے اور سر دھنتے جائیں۔ آخر میں' اقبال کے یہ اشعار آپ کی نذر کرتا ہوں جو اس کتاب کے ایک حصے میں درج ہیں۔

اک فغان بے شرر سینے میں باقی رہ گئی
سوز بھی رخصت ہوا' جاتی رہی تاثیر بھی
مرد حر زنداں میں ہے بے نیزہ و شمشیر آج
میں پشیماں ہوں' پشیماں ہے میری تدبیر بھی